© rasailojaraid.com

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی و ادبی خدمات

محمد انس حسان☆

حالاتِ زندگی

مولانا ابوالکلام آزادؔ اپنی پیدائش اور جائے پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ غریب الدیار عہد ونا آشنائے عصر و بیگانہ خویش و نمک پروردۂ ریش' معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے' ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیٔ عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متہم ...... والد مرحوم نے تاریخی نام فیروز بخت رکھا تھا...... مولد و منشاءِ طفولیت وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم ہے۔ یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً و کرامۃً' محلہ قدوہ' متصل باب السلام''۔(۱)

مالک رام (عبدالمالک) کے نزدیک اگست کی ۱۶' ۱۷ یا ۲۲ تاریخ' مولانا کی تاریخ پیدائش ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے نزدیک ۱۶ یا ۱۷ اگست صحیح تاریخ ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے نزدیک بھی اگست ہی میں ولادت ہوئی جبکہ قاضی عبدالغفار کے نزدیک ستمبر میں آپ کی ولادت ہوئی۔ حکومت ہند کے تحت چھپنے والی پروفیسر ہمایوں کبیر کی کتاب (Molana AbulKalam: A Memorial Volume) میں مطبوعہ تاریخ پیدائش ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء دی گئی ہے' جو کسی بھی صورت درست نہیں' نامعلوم اس کا ماخذ کیا ہے۔ اکثریت ۱۶ یا ۱۷ اگست پر متفق ہے' لہٰذا اسی کو درست سمجھا جائے۔(۲)

سات آٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۹۵ء میں والد کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے۔ کلکتہ میں قیام کیا اور یہیں کے ہو رہے۔ اس لحاظ سے آپ کا مولد مکہ معظمہ اور متوطن ہندوستان ہے۔ پیدائش کے وقت نام محی الدین رکھا گیا۔ تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ آزاد تخلص کرتے تھے اور کنیت ابوالکلام تھی۔ مشہور ہوئے تو کنیت اور تخلص ساتھ رہے' نام سب بھول گئے۔ ابتدا میں اپنے نام کے ساتھ ''دہلوی'' لکھا کرتے تھے۔ چند لوگوں کو آپ کے دہلوی ہونے پر کلام تھا' اس لیے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا کے نزدیک ان کے اجداد پشتوں سے دہلی میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ ابتدا ہی سے اپنے آپ کو ''دہلوی'' لکھتے رہے۔(۳) تذکرہ کے آغاز ہی میں مولانا نے نسب کے بت کو جس طرح توڑا ہے اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک نسب اور متوطن انسان کے لیے مشرف ہونے کا ذریعہ نہیں' صرف تقویٰ ہی انسان کی فضیلت کا باعث ہو سکتا ہے۔

۱۸۹۲ء میں جب مولانا کی عمر پانچ سال تھی تو حرم بیت اللہ میں عرب کے ایک عالم شیخ عبداللہ نے آپ کی

☆ استاد جامعہ قاسم العلوم' گلگشت کالونی' ملتان۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم کے باقاعدہ سلسلہ کے لیے آپ کو بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم پڑھائی۔ پھر کچھ عرصے تک آپ کے والد محترم مولانا خیر الدینؒ خود پڑھاتے رہے۔ جب فارسی اور عربی کی ابتدائی کتب پڑھ لیں تو دہلی کے بزرگ عالم مولانا محمد یعقوبؒ کو آپ کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا۔ فارسی وفقہ آپ کو اپنے والد پڑھاتے رہے اور مولانا محمد یعقوبؒ نے عربی ومنطق پڑھانی شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالحق خیر آبادیؒ کے ایک شاگرد مولوی نذیر احمد امیٹھوی نے ''مطول''، ''شمس بازغہ'' اور ''رشیدیہ'' پڑھانی شروع کیں۔ مولانا نے باقاعدہ طالب علمی کا جو بھی زمانہ گزارا وہ اپنے گھر اور اپنے والد محترم کی خانقاہ ہی کے سایہ میں گزارا۔ چنانچہ آپ خود رقمطراز ہیں کہ ''انہوں (مولانا کے والد مولانا خیر الدین) نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں''۔(۴)

شمس العلماء مولانا سعادت حسنؒ سے بھی کچھ عرصہ شرفِ تلمذ رہا۔ والد محترم کے ہاں ایک خطاط حافظ بخاریؒ تھے' کبھی کبھار ان سے بھی سبق لیتے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد شاہ محدثؒ حضرت جلال بخاریؒ کے خاندان سے تھے' ان کے درس کا چرچا سنا تو ان سے بھی دو ماہ ترمذی شریف کا درس لیا۔ اس کے علاوہ جامعہ ازہر مصر کے سید جمال الدینؒ اور شیخ عبدہؒ کی اجتہادی بصیرت وافکار سے بھی خوب استفادہ کیا۔ یہاں کی علمی صحبتوں اور تحریکات نے مولانا میں حب الوطنی کی روح پھونک دی' اور آگے چل کر یہ چیز الہلال والبلاغ کی اشاعت کا باعث بنی۔ لکھنؤ کے مشہور طبیب سید باقر حسین جو اُن دنوں اتفاقاً ایک سال کے لیے کلکتہ ٹھہرے ہوئے تھے' ان سے طب پڑھی' مگر طبیعت اس طرف آتی نہ تھی' اس لیے اسے ترک کر دینا پڑا۔

مولانا کو اپنے بچپن میں جس طرح کا گردوپیش میسر آیا اس میں اکثر بچوں کے بگڑنے کا امکان ہوتا ہے' اور اس طرح کے ماحول میں کسی نوعمر میں سرے سے کسی باعظمت شخصیت کی بنیاد ہی نہیں بنتی۔ جب اردگرد ہر طرف واہ واہ! اور جی حضوریاں ہوتی ہوں' ہر آنے والا قدموں پر ہاتھ رکھ کر سلام کرے' ہر کوئی پیرزادہ کی بلائیں لینے والا ہو تو وہاں پیرزادہ صاحب کی شخصیت' تکبّر' تن آسانی اور خوشامد پسندی کا مرقع بنتی چلی جاتی ہے' مگر مولانا کو اللہ تعالیٰ نے انوکھی طبیعت عطا فرمائی تھی۔ آپ بچپن ہی سے پیرزادگی' تن آسانی اور لہوولعب سے متنفر اور کبیدۂ خاطر تھے۔ مولانا نے خود اپنے وجدان کی راہنمائی سے اپنی شخصیت کی بنیادیں عظمت وعزیمت کے نقشے پر رکھیں۔ اس تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''......خلقت کا ہجوم واحترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے' وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب وسعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخیت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لیے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں برخود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے......لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں' مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے دوسری ہی طرف لے جارہی تھی''۔(۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا کے اسی مکتوب کا ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

''لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں' مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں...... کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا۔ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رخ ہی نہیں کرتی تھی۔''(۶)

اسی خاص طبیعت کی یہ کرشمہ سازیاں تھیں کہ آپ نے رسمی تعلیم کے نصاب کی کتب بھی دستور طالب علمی سے ہٹ کر خود اپنی ذہنی صلاحیتوں کی پرواز کے مطابق رفتار سے پڑھیں۔ خود لکھتے ہیں کہ:

''تعلیم کی جو رفتار عام طور رہا کرتی ہے میرا معاملہ اس سے مختلف رہا...... اپنے بروقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت اڑتے تو میزان و منشعب کے سوالات کرتے۔ میں انہیں منطق کے قضیوں اور اصول کی تعریفوں میں لے جا کر ہکا بکا کر دیتا۔''(۷)

یہی عمر ہے جب مولانا شک و تذبذب کے گرداب میں ایسے پھنسے کہ ایک طویل عرصے تک اس سے خلاصی ممکن نہ ہو سکی۔ مولانا کو ابتدا ہی سے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت تھی جو آہستہ آہستہ ان کی فطرتِ ثانیہ بنتی چلی گئی' جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا جا رہا تھا توں توں مذہبی عقائد و افکار میں شکوک و شبہات کی راہ وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ طبیعت کا حال یہ تھا کہ ہر لمحہ وہ کسی نئی حالت کے لیے مضطرب و بے چین تھی۔ اگرچہ یہ اپنے آبائی مذہب سے بغاوت کی پہلی سیڑھی تھی مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ مذہب ہی سے بغاوت کر بیٹھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں' ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے' جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کے چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان' تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں' بہ یک دفعہ متزلزل ہو گئیں' اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں۔''(۸)

مذکورہ بالا اقتباس پڑھ کر بعض دفعہ کوئی سطحیت پرست و جلد باز یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید یہ تو مذہب کی حقیقت و اہمیت پر کوئی حرف گیری ہے۔ حاشا و کلا ایسا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک انسان جب شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو اگر اس کی عقل کام کرتی ہے تو وہ ضرور اپنی معلومات کو اپنے مشاہدات سے تطبیق کے مرحلہ سے گزرتا ہے اور پھر وہ انسان جس نے آگے چل کر اپنے دور کے لوگوں کی فکری راہنمائی کے منصب پر فائز ہونا ہو' اس کے لیے قدرت خود اس کا سامان کرتی ہے کہ جو پیغام اس نے کل کو اپنی قوم کے سامنے رکھنا ہے اسے خود اس پر شرح صدر کا درجہ حاصل ہو اور وہ اپنے دور کے معروضی حالات میں قوم کو واضح و دوٹوک رہنمائی فراہم کر سکے' تاکہ کل جب وہ قوم کے سامنے یہ دعویٰ رکھے کہ تمہاری بگڑی ہوئی صورتِ حال کے سنوارنے کا نسخہ یہ دین ہے تو اس میں اسے نہ کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جھجک ہو نہ ابہام۔ چنانچہ مولانا خود لکھتے ہیں:

''میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں' اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں' میں جب پیاسا تھا تو میری تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا''(۹)

یہی وجہ ہے کہ مولانا نے جب دعوت وتذکیر کے میدان میں قدم رکھا اور قوم کے سامنے اپنا پیغام رکھا تو دعوت پر کان لگانے والوں نے یہی محسوس کیا کہ یہ تو ہمارا ہی وہ سبق ہے جو ہم گردشِ زمانہ کی بھول بھلیوں میں گم کر بیٹھے تھے۔ اور اس بات کو یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ مفتیٔ وقت اور مستفتی کے یقین واذعان کا جو فرق ہے' آخر وہ کیا ہے؟ یہی کہ مستفتی پیش آمدہ کسی بھی معروضی صورتحال کے شرعی حکم پر اس لیے یقین رکھتا ہے کہ مفتیٔ وقت کا فتویٰ یہی ہے اور مفتیٔ وقت جو حکم بتاتا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام کے اصول کی روشنی اسے یہی دکھا رہی ہے۔ حکم ایک ہے' لیکن اس کے مان لینے کی کیفیت میں فرق ہے۔

ایک طویل عرصے تک مولانا شکوک وشبہات کے اس گرداب میں بھٹکتے رہے اور بالآخر قرآنِ مجید کی حقیقی تعلیمات نے مولانا کے ذہن میں اٹھنے والے تمام سوالات کے جوابات دے دیے۔ قرآنِ مجید کے اس مطالعہ نے مولانا کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا' اور وہ ہر چیز کو منطقی وفلسفی نقطۂ نگاہ سے پرکھنے اور ان کے دلائل سے متاثر ہونے کی بجائے قرآن کی فطری اور سادہ تعلیمات ہی کو حجت تسلیم کرنے لگے۔ مگر شکوک و شبہات کی اس طویل صحبت کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ مولانا اپنے موروثی عقائد اور تقلیدی ایمان ہی پر قانع نہیں رہے' بلکہ انہوں نے اپنے لیے خود علم وفن کی نئی جہتیں اور راہیں نکالیں اور اسلامی تعلیمات کی روحانی اور ابدی سچائی کو اپنے اس طویل تحقیقی سفر کے نتیجے میں آخر کار پا لیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا اس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف ونزاع کی انہی متعارض راہوں اور اوہام وخیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے' جو یقین اور اعتماد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے۔ اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا تھا' وہ اس جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علت تھی وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی...... البتہ جو عقیدہ کھویا تھا' وہ تقلیدی تھا' اور جو عقیدہ پایا وہ تحقیقی تھا''(۱۰)

مولانا کے والد کے ایک مرید مولوی آفتاب الدین تھے' جو تمام عمر سروے آفس کلکتہ میں ملازم رہے' سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا تھا۔ آپ کا خاندان بغداد سے ہجرت کر کے ہندوستان آن بسا تھا۔ اللہ نے ایک بیٹے اور پانچ بیٹیوں سے نواز رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کی شادی مولانا کے بھائی ابونصر آہ سے ہوئی' جبکہ سب سے چھوٹی بیٹی زلیخا مولانا آزاد کے ساتھ بیاہی گئیں۔ بوقت شادی مولانا کی عمر بارہ سال اور زلیخا بیگم کی عمر نو سال تھی۔ مولانا کی ہمشیرہ آرزو بیگم کی روایت کے مطابق مولانا اتنی سی بات پر رو پڑے کہ انہیں زنان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خانے میں لے جایا جا رہا ہے۔ مولانا کا سسرال قریب میں ہی واقع تھا' جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولانا کے سیاسی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اکثر وقت قید و بند کی صعوبتوں میں گزرتا تھا' جس کے باعث گھر خالی رہتا۔ ان حالات میں انہی لوگوں سے گھر میں چہل پہل قائم رہتی۔

زلیخا بیگم کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

''زلیخا بیگم نے اپنی تمام زندگی ایک آئیڈیل بیوی کی طرح گزاری۔ مولانا کے فقر و فاقہ میں شریک رہیں اور خوشحالی کا دور شاذ ہی دیکھا۔ مولانا گھر میں نہ ہوتے' فون آتے تو ریسور نہ اٹھاتیں[11] مولانا خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔''[12]

مولانا کا انتقال ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء رات سوا دو بجے ہوا۔ مولانا کے دیگر رفقاء کی طرح جواہر لال نہرو کا بھی یہی خیال کہ مولانا تمام زندگی عوام سے کھچے رہے لہٰذا ان کے جنازہ میں بھی خواص ہی ہوں گے۔ مگر ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی دو لاکھ کے قریب لوگوں کا مجمع مکان کے باہر جمع ہو گیا۔ ہر کوئی غمزدہ تھا۔ ہر ایک کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دہلی شہر کا تمام کاروبار بند ہو گیا۔ ایسی ہڑتال دہلی کی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملی۔

جنازہ ان کے اسی مکان سے اٹھایا گیا۔ پہلا کندھا عرب ممالک کے سفراء نے دیا۔ اس موقع پر جواہر لال نہرو' جنرل شاہ نواز' خان محمد یونس خان' مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور راجندر پرشاد وغیرہ بھی موجود تھے۔ ہر ایک غم کا پیکر بنا مولانا کی میت کو دیکھ رہا تھا۔ پنڈت پنت نے درد سے کانپتی ہوتی آواز میں کہا: ''مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔''

بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے اور صدر جمہوریہ و نائب صدر کی گاڑی جنازہ گاڑی کے پیچھے تھی۔ جنازہ کو پریڈ گراؤنڈ میں لیجایا گیا' جہاں محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ لوگ جمع تھے۔ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی اقتدا میں ٹھیک دو بجکر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ شورش کاشمیری کے مطابق مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تحریک پر لال قلعہ اور جامع مسجد کے قلب کی پریڈ گراؤنڈ میں سرمد شہید کی قبر کے عقبی میدان کو قبر کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہیں دفن کیے گئے۔ مولانا احمد سعید نے قبر میں اتارا اور سفید کھدر میں لپٹا ایک قیمتی وجود زمین کے سپرد کر دیا۔ مولانا کی قبر جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان بنائی گئی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

''راقم الحروف کا یہ عقیدہ ہے کہ اقبال اور ابوالکلام اس صدی کے بہت بڑے مسلمان اور عبقری دماغ تھے۔ دونوں کا سیاسی میدان ہمیشہ ہی مختلف رہا' لیکن عوام کی بھیڑ سے کنارہ کیا۔ اقبال کو شاہی مسجد لاہور کے پہلو میں جگہ ملی...... ابوالکلام کو جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان قلب میں جگہ ملی کہ مولانا دونوں عمارتوں کے شکوہ کی انسانی تصویر تھے۔''[13]

مولانا کی سیاسی خدمات

ابتدا میں مولانا تشدد کے قائل تھے اور اسلامی نظام کے نفاذ کا واحد ذریعہ اسی کو سمجھتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ کا مسلمانوں کے ساتھ وہ ظالمانہ و سفاکانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برتاؤ تھا‘ جس نے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کے بچے کھچے آثار مٹا ڈالنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ یہی وہ بنیادی وجوہات تھیں جنہوں نے اول روز ہی سے انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کا لاوا مولانا کے رگ وپے میں دوڑا دیا تھا۔ اگر ”ہماری آزادی“ واقعی مولانا آزادؒ کی کتاب ہے[۱۴] تو اس کے مطابق غالباً ۱۹۰۷ء کے اواخر اور ۱۹۰۸ء کے آغاز میں مولانا مصر‘ شام‘ ترکی اور فرانس کی سیاحت کو نکلے تھے۔ لندن جانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ یکایک والد ماجد کی علالت کی خبر سن کر واپس ہندوستان لوٹ آئے۔ ان ہی اسفار میں بین الاقوامی سیاسی تحریکات اور ان کے نتائج وعوامل پر غور وفکر کرنے کا موقع ملا۔ مصر میں ان دنوں شیخ جمال الدین اور شیخ عبدہ کی تحریک کا خوب غلغلہ تھا۔ کہیں نظر سے گزرا ہے کہ مولانا نے درسِ نظامی کی تکمیل انہی ایام میں جامعہ ازہر سے کی۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً شیخین کی اجتہادی سوچ اور علمی وسیاسی بصیرت سے ضرور مستفید ہوئے ہوں گے۔[۱۵] اس کے علاوہ عراق اور ترکی کے انقلابیوں سے بھی روابط بڑھے‘ اور اصلاً انہی انقلابی تحریکات نے مولانا میں انقلاب کی روح پھونک دی اور وہ ہندوستان ایک عظیم مشن لے کر لوٹے‘ یعنی ہندوستان سے انگریز سامراج کا مکمل انخلاء۔ ”ہماری آزادی“ میں مولانا نے اپنے اس طویل سفر اور اس کے مشاہدات ونتائج کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے‘ لکھتے ہیں:

> ”جب میں عراق گیا تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے پیروؤں سے کچھ تعلقات پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ میں ینگ ٹرکس کے گروپ سے بھی ملا...... جب میں ترکی گیا تو ینگ ٹرکس تحریک کے چند لیڈروں سے دوستی ہوگئی‘ ہندوستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک ان سے خط وکتابت جاری رہی۔ عرب اور ترک انقلابیوں سے تعلقات ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے سیاسی عقائد راسخ ہوگئے...... مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی جائے اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جا کر زیادہ انہماک کے ساتھ سیاسی جدّوجہد کروں گا۔“[۱۶]

اب اس سیاسی جدّوجُہد کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اور ہندوستان جیسی غلامانہ سلطنت میں اس کا طریق کار اور حکمتِ عملی کیا ہوگی؟ اس بارے میں مولانا لکھتے ہیں کہ ”ہندوستان واپس آ کر میں کچھ دنوں غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریق اختیار کرنا چاہیے اور کیا پروگرام بنانا چاہیے؟ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی موافقت کے لیے رائے عامہ پیدا کرنا چاہیے اور اس کے لیے ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا۔ ”الہلال“ اسی غور وفکر کا نتیجہ تھا۔“[۱۷]

مولانا آزادؒ نے ہندوستان واپس آ کر ”الہلال“ کے ذریعے ان سب تحریکات کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور اسے عوام کی آواز بنا دیا۔ اسی دور میں مولانا محمد علی جوہر کا ”کامریڈ“ اور مولانا ظفر علی خان کا ”زمیندار“ بھی پوری آب وتاب سے نکلا اور یوں ان تینوں اخباروں نے مل کر ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار عوام کو آزادی کے حقیقی مفہوم سے روشناس کروایا اور ان میں براہِ راست اس تحریک میں عملی کردار ادا کرنے کا داعیہ پیدا کیا۔

اس مختصر سے سیاق وسباق کے بعد اب مولانا اور ”الہلال“ کے باہمی سفر کا جائزہ لیتے ہیں۔ ”الہلال“ کے اجرا سے پہلے مولانا کی کوئی خاص پہچان نہیں تھی اور نہ ہی وہ ہندوستان کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ ”الہلال“ نے مولانا کو امام الہند بنا دیا‘ اور ان کی آواز اور دعوت پر پورا ہندوستان ہمہ تن گوش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے الفاظ ہیں کہ ''ہم اپنا سبق بھول چکے تھے' الہلال نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلایا''۔ شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں:

''...... یہ حقیقت ہے کہ الہلال سے بڑا ہفتہ وار آج ۶۱ برس بعد بھی اردو صحافت پیش نہیں کر سکی [۱۸] نہ اتنا بڑا مجلہ' نہ اتنا بڑا ایڈیٹر اور نہ اتنا بڑا ذہنی' علمی' تاریخی فکری اور جذباتی صحیفہ۔ لوگ پڑھتے تو سر دھنتے اور دیکھتے تو مست ہوتے تھے۔ اس کی خوبیاں اس کے ساتھ ختم ہوگئیں' وہ پرچہ نہیں ایک عہد تھا' ایک تاریخ تھا' ایک انجمن تھا' ایک تحریک اور ایک اکادمی تھا''۔[۱۹]

اپنے طویل سفر سے واپسی کے بعد اگرچہ مولانا مختلف رسائل و جرائد سے وابستہ رہے' مگر جو جذبات و احساسات مولانا کے دل میں موجزن تھے' ان کے اظہار کے لیے ایک ایسے جریدہ کی ضرورت تھی جو مولانا کی بلندیٔ فکر کا ساتھ دے سکے۔ چنانچہ ۱۳رجولائی ۱۹۱۲ء کو یہ خواب ''الہلال'' کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا' اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے ہندوستان کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ مولانا نے ''الہلال'' انتہائی غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد جاری کیا تھا۔ مولانا یہ فیصلہ تو اس کے اجرا سے پہلے ہی کر چکے تھے کہ ہندوستان کو فرنگی تسلّط سے آزاد ہونا چاہیے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بخوبی جانتے تھے کہ اس فیصلہ پر عملی قدم اٹھانا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راستہ ہے جس کے چپے چپے پر کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ہندوستان میں انفرادیت سے ہٹ کر اجتماعی بنیادوں پر جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و قوم کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے تو آزادی کا حصول کسی صورت ممکن نہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں چند اخبارات کو عوامی اخبارات ہونے کا اعزاز حاصل ہوگیا تھا' مگر ان اخبارات کی زیادہ تر توجہ قومی و بین الاقوامی سیاست اور ان کے نتائج و عوامل کی بجائے ذاتی و فروعی مسائل تک محدود تھی' اور ملکی سیاست میں کسی فعال تحریکی کردار کی توقع ان میں سرے سے مفقود تھی۔ مذہبی اور سیاسی زندگی کو دو مختلف وظائف سمجھ لیا گیا تھا اور یہی موضوعات ہمارے بھائیوں کی فکر و نظر اور دعوت و تذکیر کی انتہائے معراج تھے۔

ان گونا گوں حالات میں ''الہلال'' کی سیاسی و مذہبی تعلیم نیز اس کے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے؟ اس کا تذکرہ مولانا نے ''الہلال'' ۸رستمبر ۱۹۱۲ء کے اداریے میں کیا ہے۔ چنانچہ مولانا نے لکھا ہے:

''(۱) ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو قرآن ہی ہے' اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔

(۲) ہم نے تو اپنے پولیٹیکل (سیاسی) خیالات مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر علیحدہ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔

(۳) قرآن سامنے ہوتا تو نہ گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا نہ ہندوؤں کے اقتدار کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو سب کچھ سکھایا ہے۔

(۴) اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۵) الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے' خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی یا سیاسی ہوں' خواہ اور کچھ ہو۔ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔

(۶) اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں' وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں داخل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلنے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ نہیں صرف خدا کے ساتھ ہیں۔

(۷) الہلال کی پالیٹکس میں یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد رکھیے نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہوئیے۔ صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے''۔[۲۰]

''الہلال'' اپنے ان اغراض و مقاصد میں کافی حد تک کامیاب ہوا اور اس کی شہادت ان تاریخی شخصیات کی آراء ہیں جن کی زندگیوں کو الہلال نے یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ حضرت شیخ الہند ؒ کی رائے پہلے نقل کی جا چکی ہے کہ ہم اپنا سبق بھول چکے تھے' الہلال نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ مولانا حسین احمد مدنی ؒ جیسی نادر الوجود شخصیت نے کئی بار اس کا برملا اظہار کیا کہ اگر ابوالکلام نہ ہوتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کا انقلابی سفر دیر تک معطل رہتا۔[۲۱] مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ فرماتے تھے کہ مجھے سیاست کا چسکا الہلال نے ڈالا۔ شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اگرچہ مولانا سے مختلف سیاسی راستے پر تھے لیکن وہ بھی یہ کہتے تھے کہ مولانا آزاد نے سیاسی آواز کو دینی لہجہ دے کر اس زمانے کے علماء کو خطابت کا ایک نیا اسلوب دیا اور اس یگانہ اسلوب کے سحر میں کسی کو اختلاف نہیں۔ میں نے ابتداءً خود الہلال کی خوشہ چینی کی ہے۔[۲۲] مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوبِ بلاغت' کمال انشا پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خوان نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معنی اور مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔[۲۳] چوہدری افضل حقؒ جو احرار کے شاہ دماغ سمجھے جاتے تھے' اپنی زندگی میں برپا ہونے والی تبدیلی کا محرک الہلال کی جوشیلی اور غیورانہ تحریروں کو قرار دیتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہرؒ خود ان دنوں ''ہمدرد'' نکال رہے تھے اور معاصر اخبار ہونے کی حیثیت سے دونوں اخبارات کے مابین اکثر رقیبانہ چشمک بھی رہتی تھی' لیکن اس کے باوجود مولانا جوہرؒ نے جن الفاظ میں ''الہلال'' کی علمیت' جامعیت اور ہمہ گیری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

''جب الہلال کو اور فروغ ہوا تو میں نے علوم مذہبی میں اپنی کم مائیگی کو اسی کے مضامین پڑھ پڑھ کر بہرہ اندوزی سے بدلنے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ ''البلاغ'' کی اشاعت کے بعد پھر چندواڑہ کی نظر بندی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاری رکھا گیا۔"(۲۴)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ بھی الہلال کے بڑے مداح تھے۔ اگرچہ حضرت علامہ میدانِ علم کے نامور شاہسوار تھے لیکن میدانِ سیاست سے انہیں کوئی خاص موانست نہ تھی۔ اس کے باوجود الہلال کی دعوت اور ہندوستان کے غلامانہ دور میں اس کی آزادی و حریت کے خوب معترف تھے۔ فرماتے تھے: "ابوالکلام نے الہلال کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا ہے۔"(۲۵)

مولانا نے خود ایک جگہ "الہلال" کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"...... یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ الہلال نے مسلمانوں کو مقدار کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی، اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی...... میں بتلانا چاہتا ہوں کہ "الہلال" تمام تر "آزادی یا موت" کی دعوت تھی۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک بحث و نظر کی بنیاد ڈالی، اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے، صرف اس قدر اشارہ کروں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے، الہلال اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔"(۲۶)

اگر حق و صداقت کے لیے جدّ و جہد کی جائے تو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندان کی سلاخوں کو سینے سے لگاتے اور ہتھکڑیوں کو چومتے ہوئے حق گوئی اور جہد پیہم سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ ہر حق گو مجاہد کی طرح مولانا کو بھی اس سنتِ یوسفی کو ادا کرنا پڑا۔

۲۸؍ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ترکوں کی طرف داری کے جرم میں ڈیفنس ایکٹ دفعہ ۳ کے تحت حکم نامہ دے دیا کہ مولانا چار دن کے اندر اندر حدودِ بنگال سے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ مولانا رانچی چلے گئے، جہاں پانچ ماہ بعد نظر بند کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں دو مرتبہ رانچی اور تین مرتبہ کلکتہ میں ان کے مکانوں کی تلاشی ہوئی، جن میں کئی قیمتی مسودات ضائع ہوئے۔ مولانا کی کتاب "تذکرہ" انہی ایام کی یادگار ہے۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں آپ کو رہا کر دیا گیا۔ انہی دنوں ملک میں تحفظِ خلافت اور بعد ازاں ترکِ موالات کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ مولانا نے ان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسی زمانے میں عوام کے اصرار پر بیعت امامت شروع کی، جس میں تحریک کے سرگرم رہنما حضرت شیخ الہندؒ نے سب سے پہلے مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی اور یوں انہیں ابوالکلام آزاد سے "امام الہندؒ" بنا دیا۔ اس دعوت کی پانچ شرائط تھیں:

(۱) نیک کاموں کا حکم، برائی سے روکنا اور تو صیۂ صبر۔

(۲) محبت اور نفرت دونوں اللہ کے لیے۔

(۳) سچائی کی راہ میں ہر شے سے بے پروائی۔

(۴) اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ محبوب رکھنا۔

(۵) اچھے کاموں کی اطاعت۔(۲۷)

اس تحریک کے نتیجے میں ۱۰؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا، جس کے نتیجے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔ اسی مقدمے میں عدالت کے سامنے اپنا وہ شہرۂ آفاق بیان پیش کیا جو ''قولِ فیصل'' کے نام سے مشہور ہے۔ ۶؍جنوری ۱۹۲۳ء کو رہائی نصیب ہوئی۔

۲۱؍اگست ۱۹۳۰ء کو سائمن کمیشن کی مخالفت پر دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۱؍مئی ۱۹۳۲ء کو رہائی نصیب ہوئی۔ اسی زمانے میں ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد منصۂ شہود پر آئی۔ نیز مولانا کانگریس کے صدر بھی اسی سال بنائے گئے۔ ۳؍جنوری ۱۹۴۱ء کو مولانا کو کانگرس کے صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد سے گرفتار کرلیا گیا۔ ایک سال کی زندانی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ۳؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو رہا ہوئے۔

۹؍اگست ۱۹۴۲ء کو ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تجویز کی منظوری کے بعد دوبارہ گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں نظر بند کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا کی اہلیہ نے وفات پائی جن کے جنازے میں شرکت کی اجازت تک حکومت برطانیہ نے نہ دی اور یوں مولانا اپنی رفیقہ حیات کا آخری دیدار تک نہ کر سکے۔ اسی دوران مولانا کی دو بہنوں کا انتقال ہوا۔ ''غبارِ خاطر'' کے خطوط جو مولانا نے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام لکھے مگر روانہ نہ کیے جا سکے' وہ بھی مولانا نے انہی ایام میں تحریر فرمائے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں احمد نگر سے بانکوڑا جیل منتقل کر دیا گیا اور یہیں سے ۱۵؍جون ۱۹۴۵ء کو رہائی پائی۔ یوں گرفتاری کی کُل مدت تقریباً ۱۰ سال اور ۷ مہینے بنتی ہے۔ یعنی زندگی کا ساتواں حصہ قید و حراست میں گزرا۔ مولانا خود ''غبارِ خاطر'' میں لکھتے ہیں:

> ''عمر کے ترپین برس جو گزر چکے ہیں' ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے۔
> گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔ تورات کے احکامِ عشرہ (۲۸) میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا' یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا۔''(۲۹)

مولانا نے ان ایام میں جس ثابت قدمی اور شجاعت کا مظاہرہ کیا وہ اپنی جگہ قابلِ تحسین ہے۔ بہت سے رہنماؤں کو قید و بند کی زندگی کا شکوہ کرتے سنا گیا ہے' مگر مولانا ان ایام کو اپنی متاعِ حیات سمجھتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ ''وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے۔''(۳۰)

قید و بند کی اس زندگی میں اگر مولانا کے معمولات کا جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ لوگ ان حالات میں اپنی اداسی اور تنہائی ختم کرنے کے لیے انجمن تلاش کرتے ہیں' لیکن مولانا تنہائی ہی کو اپنی انجمن اور راحت و سکون کا سامان سمجھتے ہیں۔ ''غبارِ خاطر'' میں لکھتے ہیں: ''میں جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کی لیے سزا کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جا سکیں۔''(۳۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا' اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ' وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا' سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔''(۳۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا کے نزدیک اصل زندگی جسم کی آسائش نہیں' بلکہ وہ اصل زندگی دل ودماغ کی زندگی کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''کھانے پینے اور ساز وسامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کرسکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں''۔(۳۳)

اگر مولانا کی اس رائے کو اپنا لیا جائے تو خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں' کیسی ہی مصیبتیں اور غموں کی بارش کیوں نہ ہو رہی ہو' انسان کے لیے کسی غم وتکلیف کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔ مولانا کی اس طویل زندانی زندگی کے پیچھے بھی ان کا یہی فلسفہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کا عملی مظاہرہ ان کی زندگی کے ایام قید وبند میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے اور اس کی توثیق ان کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ''میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو' کوئی جگہ ہو' اس کی تڑپ دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا' اور ساری دنیا اجڑ گئی''۔(۳۴)

دورانِ اسیری مولانا کے روزمرہ معمولات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وقت کے پابند وہ ہمیشہ سے تھے اور وقت کے ضیاع کو زندگی کا ضیاع تصور کرتے تھے' لیکن ان ایام میں بھی وہ بدستور اپنی اس عادت پر قائم رہے۔ بقول شورش کاشمیری ''وہ چھوٹے سے چھوٹے معمول کو بھی کسی بڑی سے بڑی مداخلت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو جلد ہی سو جاتے۔(۳۵) صبح مولانا بہت جلد اٹھنے کے عادی تھے' منہ اندھیرے ان کی چائے نوشی کے تذکرے سے ''غبارِ خاطر'' بھری پڑی ہے۔

مولانا کے ساتھ جو لوگ قید وبند میں شریک رہے' انہوں نے اپنی اسارتی رفاقت کا تذکرہ مختلف مضامین میں کیا ہے۔ مولانا اسد اللہ خان میرٹھیؒ جو میرٹھ جیل میں مولانا کے ہمراہ تھے' اپنا مشاہدہ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ''مولانا کی شخصیت سے جیل خانے میں استبداد پر خوف طاری رہتا اور کوئی سپرنٹنڈنٹ کسی سلسلے میں کبھی چوں چرا نہ کرسکتا تھا''۔ ڈاکٹر سید محمود کے بقول پس دیوارِ زنداں وہ اُسوۂ یوسفی کا صحیح نمونہ تھے۔ حافظ علی بہادر خان جو دورانِ اسیری مولانا کے ساتھ رہے' لکھتے ہیں کہ ''مولانا خبریں منگوانے اور خبریں بھجوانے میں جیل خانے کے ضابطوں سے بے نیاز تھے۔ بقول شورش چونکہ ہر لحاظ سے تنہا تھے اس لیے اندر بھی کوشش کر کے تنہا ہی رہتے۔ غرض مولانا ہندوستان میں ان علمائے حق کا مثالی وجود تھے جو مختلف ادوار میں عصری استبداد سے پنجہ آزماتے رہے اور جن کی عزیمت کا تذکرہ مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کا روشن باب ہے''۔(۳۶)

مولانا کی ادبی خدمات

درحقیقت مولانا ابوالکلام آزادؒ سیاست کے آدمی نہ تھے بلکہ اس پرخار وادی میں وہ اتفاقاً آ نکلے تھے۔ اس کا اظہار بارہا مولانا نے خود بھی کیا ہے۔ مولانا کی علمیت اور ذہنیت کی اصل جولانگاہ علم وادب تھا اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ برصغیر پاک وہند میں اپنی نوعیت کے منفرد اور یگانہ ادیب وانشا پرداز تھے۔ اگر قوم وملّت کا درد وغم اور وطن کی آزادی کا عزم انہیں ہندوستان کے سیاسی دھارے میں نہ لے آتا تو وہ آج ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب ہوتے۔ اپنی طبیعت کی اس افتاد کا تذکرہ مولانا نے خود ایک جگہ کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا' سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا''۔(۳۷)

اس کے باوجود اردو ادب پر مولانا کے جو احسانات ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ قلیل الفرصتی اور انتہائی مصروفیت کے باوجود جو کچھ انہوں نے لکھ ڈالا ہے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے۔

مولانا کی ادبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۶ء تک کا ہے' جب وہ اخباروں اور رسالوں میں لکھتے رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں کی موجودگی میں اپنے قلم کا سکّہ جما لیا (تذکرہ اسی دور کی یادگار ہے۔) اس دور کی تحریروں میں شدتِ احساس' شدّتِ اظہار' لامتناہی تخیّل اور بے ضبط مبالغہ سمیت رومانی اسلوبِ تحریر کے وہ تمام اجزاء بدرجہ اَتم پائے جاتے ہیں جنہیں ناقدین ادب اس عالی صنف کی معراج قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کا قلم صرف یہیں تک محدود رہا' بلکہ اس کے ساتھ ساتھ الہلال والبلاغ کی تحریروں میں اس کی متضاد اخلاقی شدت اور انتہائی خود اعتمادی' جو بسا اوقات خود پسندی تک پہنچ جاتی ہے' کی واضح چھاپ محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس تضاد کی تاویل یہی کی جا سکتی ہے کہ الہلال والبلاغ کے مضامین اور ''تذکرہ'' کے عجوبانہ اسلوب کو رومانوی یا خطیبانہ اندازِ تحریر کی بجائے اگر زعیمانہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ ''تذکرہ'' کی مذکورہ عبارت کو پڑھیے جس سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے:

> ''وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے' اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو' اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں' اب اس کا کونہ کونہ' چپہ چپہ' ہشیاری و بینش کا مرقع تھا' بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا' پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی' پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کیے۔ خاکِ پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بارہا اترنا پڑا' تاکہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا' تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے''۔(۳۸)

اس کے ساتھ ساتھ ''الہلال'' میں مولانا کا جو طرزِ خطاب ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:

> ''اے عزیزانِ ملّت! میں کیونکر تمہیں اپنے دل کے خونچکاں ٹکڑے دکھلاؤں' جس کے ہر ٹکڑے پر زخموں اور ناسوروں کے ہزاروں نشان ہیں۔ اور پھر میں کیونکر اپنا دل تمہارے پہلو میں رکھوں کہ تم اس صدائے الٰہی کو نہیں سنتے' پر میں سنتا ہوں اور کانٹوں پر لوٹتا اور آگ کے شعلوں میں تڑپتا ہوں۔ تم میری آواز سن سکتے ہو' پر اس سوزش و اضطراب کے آتش کدے کو تو نہیں دیکھ سکتے' جو میرے اندر سلگ رہا ہے' اور جس کے شعلے اب اس قدر بھڑک اٹھے ہیں کہ میں ان کے دھوئیں کو نہیں دبا سکتا''۔(۳۹)

ان دونوں طرزِ خطبات میں ایک چیز قدرے مشترک ہے اور وہ ہے مولانا کا زورِ قلم۔ جہاں تک معنی و مفہوم کا تعلق ہے تو ان دونوں میں کوئی مماثلت نہیں۔ اس دور میں مولانا پر عربیت اور فارسی کا بڑا غلبہ رہا اور ان ہر دو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبانوں کے ملاپ کے نتیجے میں جو ادب تخلیق ہوا اسے مولانا آزاد کے اصطلاحی ادب کا نام دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کی مثالوں سے مولانا کی کتاب ''تذکرہ'' بھری پڑی ہے۔ عملی مشاہدہ کے لیے ذیل کی ان سطور پر غور فرمائیں:

''یہی تخریج در تخریج' وتفریع در تفریع' وقیاس در قیاس واستنباطاتِ رائیہ چند در چند' واقناع بر مجرد قواعد منطقیہ جزئیات وکلیات وتمثیل وتقسیم' وابعد بُعد و اھجر ھجر اصلین اساسین کتاب وسنت کی مصیبتِ عظمیٰ و رزیت کبریٰ ہے' جس کی وجہ سے قرناً بعد قرنٍ ونسلاً بعد نسلٍ سخت وشدید غلطیاں بلکہ گمراہیاں واقع ہوتی رہیں اور کارخانۂ شرع میں فسادِ عظیم رونما ہوا۔''(۴۰)

اس طرح کی ثقیل ومبہم عبارات ''تذکرہ'' میں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ طرزِ بیان نہ اس سے پہلے کسی کا تھا اور نہ بعد میں اس کا کوئی جانشین ہوا۔ مولانا اس مخصوص طرزِ تحریر کے خاتم تھے۔ بہرحال یہ دور مولانا کے قلم کے شباب کا دور تھا اور اس دور کی تحریروں میں اخلاقی اور تخلیقی ادب کے جو نقوش انہوں نے چھوڑے ہیں وہ انہیں معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں۔

مولانا کی ادبی زندگی کا دوسرا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کا ہے جس میں وہ زیادہ تر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے کام میں مصروف رہے۔ اس دور میں باوجود سیاسی جھمیلوں کے ان کا دماغ زیادہ تر قرآنی علوم و معارف میں ڈوبا رہا (ترجمان القرآن اسی دور کی یادگار ہے)۔ اس کا اثر ان کے ادبی طرز پر یہ پڑا کہ شدتِ احساس کا رخ خود بینی سے خدا بینی کی طرف مڑ گیا اور زورِ بیاں خود نمائی کی جگہ حق نمائی میں صرف ہونے لگا۔ چنانچہ اب لکھنے والے کے مخاطب لوگوں کے جذبات نہیں بلکہ ان کے ضمیر تھے اور اس مقصد سے پیچھے جو محرکات کارفرما تھے وہ اپنی عزت وعظمت کو بڑھاوا دینا نہیں بلکہ لوگوں کی مذہبی اور اخلاقی روح کا جگانا تھا۔ ''ترجمان القرآن'' کی مندرجہ ذیل سطور پڑھیے جس سے ان کے اس دور کے ادبی رجحان کا پتا چلتا ہے:

''......فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں' بلکہ اس طرح بناتی سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن وزیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمو پیدا ہوگئی ہے۔ کائناتِ ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو' اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن ورعنائی نے ایک نقابِ زیبائش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر وگردش' سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی' چاند کی گرد اور اس کا اتار چڑھاؤ' فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں' بارش کا سماں اور اس کے تغیرات' سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی' پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب...... غرضیکہ تمام تماشا گاہِ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے' اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس پردۂ ہستی کے پیچھے حسن افروزی وجلوہ آرائی کی کوئی قوت کام کر رہی ہے' جو چاہتی ہے کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے' حسن وزیبائش کے ساتھ ظہور میں آئے' اور کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ نگاہ کے لیے نشاط' سامعہ کے لیے سرور اور روح کے لیے بہشت راحت وسکون بن جائے۔''(۴۱)

تیسرا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک کا ہے۔ اس دور میں مختلف عوامل نے مولانا کی طبیعت اور ان کے ادبی اسلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ عمر' تجربہ اور قومی ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے مزاج میں کافی اعتدال پیدا کر دیا۔ نیز بیس سال مسلسل قرآن مجید کے فہم وتفہیم میں مصروف رہنے سے ان کے مذہبی جذبات و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احساسات پر سلوک کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ اس دور میں مولانا کی زیادہ توجہ مغربی ادب کی طرف رہی اور اس مطالعہ کے نتیجے میں ان کی تحریر میں اعتدال کی وہ شان پیدا ہوگئی جو مغربی ادب میں انشاپرداز کا منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں کہ ''غبارِ خاطر'' کے اسلوب میں جوان کے اس زمانے کی طرزِ بیان کی پوری نمائندگی کرتا ہے' دریائے فصاحت کی روانی تو بدستور قائم ہے' لیکن رو سے دریا کی تیزی اور تندی کی جگہ قعرِ دریا کے جزم و سکون نے لے لی ہے۔ اب صحتِ فکر' ہمواری اور توازن نے مولانا کی تحریر میں اس ادیبانہ اسلوب کی شان پیدا کر دی ہے جو جدید مغربی ادب میں بہترین انشاپردازوں کا طرۂ امتیاز ہے''۔(۴۲) ذرا غبارِ خاطر کی ان سطور کا مطالعہ کیجئے:

> ''جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو' جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو' جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں' کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں' جہاں دوپہر ہر روز چمکے' شفق ہر روز نکھرے' پرند ہر صبح و شام چہکیں' اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟''(۴۳)

اس ادیبانہ اسلوب میں علمی طرزِ بیان کی تمام بنیادی صفات بدرجہ اَتم پائی جاتی ہیں' پوری عبارت میں صحتِ فکر اور الفاظ و معانی کا ایسا خوبصورت توازن پایا جاتا ہے کہ تمام عبارت سے اگر ایک لفظ بھی ہٹا دیا جائے تو مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ مولانا کے اسلوبِ تحریر میں قرآن کے لب و لہجہ کی واضح چھاپ محسوس کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ مولانا نے لکھنے کا انداز' لب و لہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے شخص اور آخری شخص ہیں جنہوں نے براہِ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی اندازِ بیاں اور زورِ کلام اور وعید و تہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں کو رعشہ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ ذرا ان سطور پر غور فرمائیں:

> ''میں وہ صور کہاں سے لاؤں' جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ میں قوت کیسے پیدا کروں' جن کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت آ درہوشیار ہو جائیں؟ آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل' جن کو زوالِ ملت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر' جو آتش غیرت و حمیّت کی سوزش کے لذّت آشنا ہیں''۔(۴۴)

مولانا ماہر القادریؒ نے انسان کی قلبی کیفیات کو دو اجزاء میں تقسیم کیا ہے' قنوطیت اور رجائیت۔ ان کے نزدیک کل دنیا کے مختلف النوع و متباین الجنس انسان ان دو کیفیات میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ بعض انشاپردازوں نے قنوطیت اور بعض نے رجائیت کو اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ اگرچہ قنوطیت و یاس انگیز مضامین اسباقِ عبرت ہوتے ہیں مگر اعلیٰ خیالات' مستحکم عزائم اور بلند حوصلگی میں ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس دل اضطراب اور حزن و ملال کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ مولانا کی طبیعت رجائیت کی طرف زیادہ مائل ہے اور وہ یاس انگیز مضامین کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ غمگین موضوعات پر قلم ہی نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٹھاتے۔ مشہد اکبر اور ترکوں کی حریت واستقلال اور شہادتوں پر ان کے قلم نے خون کے آنسو برسائے ہیں۔ لیکن ان مضامین کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ غمگین سے غمگین تر مضمون لکھتے وقت بھی امید و رجا کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی حادثہ یا مشکل کی منظر کشی سے زیادہ اس کے مناسب اور دیرپا حل کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگِ طرابلس میں مسلمانوں کی خون ریزی پر بجائے اشک و ندامت کے آنسو بہانے کے مولانا اس خون ریزی اور سفا کی کو مسلمانوں کی حیاتِ نو بتلاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''جنگ طرابلس ایک خون ریزی تھی' لیکن غور کیجیے تو اسی خون ریزی نے اسلام کے نئے دورِ حیات کی بنیاد رکھ دی ہے۔ دنیا میں اصلی طاقت اخلاقی طاقت ہے اور اصل فتح' اخلاقی فتح ہے۔ اس جنگ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مردہ جذبات میں روح پھونک دی' اور ایک اصلی اور اخلاقی حرکت تمام عالم اسلامی میں پیدا کر دی۔''(۴۵)

رجائیت کا یہ طبعی میلان مولانا کی تمام ادیبانہ زندگی پر حاوی ہے اور اس کی شہادت ''الہلال'' کے وہ مضامین ہیں جنہوں نے ہندوستان کے تاریک دور میں بالخصوص مسلمانوں اور بالعموم دیگر اقوام کے لیے روشن چراغ کا کردار ادا کیا۔

مولانا کی نثر کی ایک اور بڑی خوبی الفاظ و معانی کی درست نشست و برخاست اور پُر جمال الفاظ کے چناؤ کے ساتھ ساتھ برمحل قوی دلائل سے قاری کو اپنی بات قائل کر لینا ہے۔ واقعہ نگاری اور منظر کشی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی تحریریں جوش و جذبات سے معمور ہوتی ہیں۔ بقول مولانا ماہر القادریؒ کے ان کا لفظ لفظ جوش و اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور ساتھ ہی واقعات کی تصویر بھی نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ جہاد کا ذکر کریں گے تو محسوس ہوگا کہ مجاہدین کی تلواریں واقعی بے نیام ہیں' ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کی طنابیں لرز رہی ہیں۔ تکبیر کے نعروں سے رزم گاہ میں گونج پیدا ہوگئی ہے۔ باطل کا پرچم سرنگوں ہو رہا ہے اور حق کی فتح ہو رہی ہے...... ان کا اندازِ تحریر دلوں کو ہلا دینے اور کپکپا دینے والا ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو جوش سے معمور کر دیں اور دنیا کا ہر تغافل آمیز سکونِ حرکت سے مبدل ہو جائے۔(۴۶)

مولانا کے ادبی مقام کا ان کے معاصر انشا پردازوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔

(۱) اردو کے مشہور انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کی نثر کے بارے میں لکھا ہے: ''قادر الکلام کا لفظ ہمارے ہاں شاعروں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نثر نگاروں میں کسی پر اس کا اطلاق اگر پوری طرح ہو سکتا ہے تو وہ ابوالکلام کی ذات ہے۔''(۴۷)

(۲) ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان الفاظ میں ان کے اسلوب کو خراج تحسین پیش کیا ہے: ''ابوالکلام کو خدا نے عظیم شخصیت عطا کی ہے' مگر جس جوہر خاص نے ان کی شخصیت کو عظیم تر بنایا ہے' وہ ان کا عظیم اسلوب ہے جس میں ان کا عزم آہنی' ان کا علمی تبحر' ان کا تجدد (Modernism) ان کی دلکش جمالیت' ان کی داعیانہ خطابت' تحیر خیزی اور ہیبت انگیزی بطور عناصر ترکیبی کارفرما ہو کر ان کے طرزِ بیان کو وہ ارفع مقام بخشتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جو قدیم عرب کے شعلہ نفس خطیبوں اور قدیم یونان و روما کے ''آ زر فشاں'' انشا پردازوں کو حاصل تھا''۔(۴۸)

(۳) آل احمد سرور مولانا کی نثر کو اردو ادب میں اجتہاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں' چنانچہ لکھتے ہیں :
''جدید اردو نثر عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی وہ ابوالکلام نے لے لیا۔ عرب کے سوزِ دروں اور عجم کے حسنِ طبیعت' دونوں کو اردو میں سمولینا اور اردو کو عربی اور فارسی کا غلام نہ ہونے دینا معمولی کام نہیں''۔(۴۹)

(۴) سجاد انصاری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ: ''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا' یا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم''۔(۵۰)

یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی ادبی خدمات کو اردو ادب میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ادبی شہ پاروں کو اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس باب میں وہ اپنے فن کے مجتہد تھے اور ان کا یہ فن انہی سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گیا۔ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ایک ہی وقت میں دو عبقری شخصیات ہوئی ہیں' ابوالکلام اور اقبال' اور ان دونوں کے ڈھب پر اگر آج بھی کوئی لکھاری لکھنا چاہے تو فوراً پکڑا جائے گا۔ گویا ان کا اندازِ تحریر کاپی (copy) نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور چیز جو ان دونوں میں مشترک ہے وہ ہے بامقصد نثر نگاری اور بامقصد شاعری۔ چنانچہ مولانا کی نثر میں اور اقبال کی شاعری میں مقصدیت کو جو مقام حاصل ہے وہ اور کسی نثر نگار یا شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔ اگرچہ سرسید احمد خان اور اس قبیل کے دیگر افراد کے ہاں بھی یہ بامقصد ادب ملتا ہے مگر یہ مقصدیت محض اصلاحِ معاشرہ تک محدود تھی اور مسلمانوں کے زوال کی دیگر وجوہات پر اس کی نظر نہیں تھی۔ جبکہ آزاد اور اقبال کے ہاں جو مقصدیت ملتی ہے اس میں قوم وملت کے زوال کے تمام اسباب وعوامل پر بحث کی گئی ہے اور اس لحاظ سے یہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ پر بھی ایک ایسا عظیم احسان ہے جس کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا۔ بطورِ مثال مولانا کے چند ادبی ونثری نمونے پیش کیے جاتے ہیں' جن سے ان کے ادبی مقام اور خدمات کا پتا چلتا ہے:

(۱) کارسازِ قدرت کی بھی یہ کرشمہ سازیاں ہیں! کچھ خاک امید کی لی اور کچھ خاکسترِ حسرت کی۔ دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا اور انسان نام رکھ کر اس ہنگامہ زارِ ارضی میں بھیج دیا۔ کبھی امید کی روشنی سے شگفتہ ہوتا ہے' کبھی ناامیدی کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے...... پس اے ساکنانِ غفلت آبادِ ہستی! وائے راہروانِ سفر مدہوشی وفراموشی!! مجھے بتلاؤ کہ تمہاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟...... نہیں معلوم آغازِ عالم سے آج تک یہ سوال کتنے دلوں کے اضطراب والتہاب کا باعث ہوا ہوگا؟ مگر سچ یہ ہے کہ اپنے کان ہی بہرے ہیں' ورنہ کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ اس سوال کا جواب نفی میں دے رہا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز سے
ہاں ورنہ جو حجاب ہے' پردہ ہے ساز کا(۵۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) آہ! کاش مجھے وہ صورِ قیامِ قیامت ملتا‘ جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا‘ اس کی ایک صدائے رعد آسائے شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلت ورسوائی کو بیدار کرتا‘ اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیونکہ بہت سو چکے‘ اور بیدار ہو! کیونکہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے جو تمہیں موت کی جگہ حیات‘ زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے![۵۲]

(۳) میں وہ صور کہاں سے لاؤں‘ جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں جن کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت آور ہشیار ہو جائیں؟ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل‘ جن کو زوالِ ملت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر‘ جو آتشِ غیرت وحمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟[۵۳]

(۴) اس بارگاہِ سود وزیاں کی کوئی عشرت نہیں جو کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلالِ صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا جو دردِ کدورت اپنی تہہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامیابی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا اور خندۂ بہار کے پیچھے گریۂ خزاں کا شیون برپا رہا۔[۵۴]

(۵) جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چُن رہے تھے‘ تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انہوں نے پھول چن لیے اور کانٹے چھوڑ دیے۔ ہم نے کانٹے چن لیے اور پھول چھوڑ دیے۔[۵۵]

(۶) تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے‘ لیکن منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے‘ تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔[۵۶]

حواشی

(۱) ابوالکلام آزاد: تذکرہ‘ ص ۳۱۰۔۳۱۱۔۳۱۲

(۲) ابوسلمان شاہجہانپوری: مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ‘ ص ۷۰

(۳) ابوالکلام آزاد: تذکرہ‘ ص ۳۱۱-۳۱۲

(۴) حوالہ ایضاً

(۵) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر‘ ص ۱۳۹-۱۴۰

(۶) ایضاً: ص ۲۶

(۷) ایضاً: ص ۱۵۸

(۸) ایضاً: ص ۱۵۹-۱۶۰

(۹) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن‘ ج ۱‘ ص ۱۹

(۱۰) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر‘ ص ۹۳

(۱۱) ایضاً: ص ۱۰۶

(۱۲) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر‘ ص ۳۱۰

(۱۳) چٹان: ۳/ مارچ/ ۱۹۵۸ء

(۱۴) ایضاً

(۱۵) مولانا کے اکثر مخلصین نے اپنی کتب میں یہی لکھا ہے۔ لیکن کہیں یہ بھی نظر سے گزرا ہے کہ مولانا کی برسی کے موقع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر جواہر لال نہرو نے ہمایوں کبیر کی کتاب کی ان سطور کی تصحیح فرمائی تھی کہ مولانا مصر گئے ضرور تھے لیکن ان کا جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہونا کسی طور درست نہیں۔ واللہ اعلم!

(۱۶) ہماری آزادی: پہلا باب
(۱۷) ایضاً
(۱۸) جس زمانے میں یہ الفاظ لکھے گئے تھے اس کے مطابق الہلال کو ۶۱ برس بیت گئے تھے۔
(۱۹) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد‘ ص ۳۸۹-۳۹۰
(۲۰) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد‘ ص ۴۵۷
(۲۱) حوالہ ایضاً
(۲۲) معارف: اکتوبر ۱۹۳۲ء‘ ص ۳۱۳
(۲۳) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد‘ ص ۴۵۸
(۲۴) افضل حق قرشی: ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ‘ ص ۱۳
(۲۵) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد‘ ص ۴۵۸
(۲۶) ابوالکلام آزاد: قول فیصل‘ ص ۶۸-۶۹
(۲۷) یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور اس سے مولانا بہت مایوس ہوئے۔ اس موضوع پر ملاحظہ ہو ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتاب ''جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی''۔
(۲۸) احکامِ عشرہ تورات کی کتابِ استثناء میں آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو (۵:۷-۲۱)
(۲۹) ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر‘ ص ۸۶-۸۷۔ یہ سطور ۱۱ راگست ۱۹۴۲ء کو لکھی گئی تھیں۔ اس حساب سے مولانا کی زندگی کا ہر ساتواں دن قید میں گزرا تھا۔ اس کے بعد مولانا دو سال گیارہ مہینے مزید قید رہے اور یوں یہ مدت سات سال آٹھ مہینے سے بڑھ کر دس سال سات مہینے ہو گئی۔
(۳۰) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر‘ ص ۸۷
(۳۱) ایضاً: ص ۱۴۲
(۳۲) ایضاً: ص ۱۴۵
(۳۳) ایضاً: ص ۱۳۶
(۳۴) ایضاً: ص ۱۲۷
(۳۵) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد‘ ص ۸۴
(۳۶) ایضاً: ص ۹۹-۱۰۰
(۳۷) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر‘ ص ۱۴۳
(۳۸) ابوالکلام آزاد: تذکرہ‘ ص ۳۲۵
(۳۹) الہلال: شمارہ ۷ رجمادی الثانی ۱۳۳۱ھ
(۴۰) ابوالکلام آزاد: تذکرہ‘ ص ۹۹-۱۰۰
(۴۱) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن‘ ج ۱‘ ص ۷۰
(۴۲) ابوسلمان شاہجہان پوری: مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ‘ ص ۱۶۳
(۴۳) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر‘ ص ۱۲۶-۱۲۷
(۴۴) اصغر مغل: ابوالکلام آزاد کے ادبی شہ پارے‘ ص ۱۱۸
(۴۵) ابوسلمان شاہجہان پوری: مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ‘ ص ۱۳۶
(۴۶) ہمایوں: نومبر ۱۹۳۴ء‘ ص ۸۴۰
(۴۷) نقوش: ستمبر ۱۹۶۵ء‘ ص ۵۱۶
(۴۸) ادب لطیف: مئی ۱۹۵۴ء‘ ص ۱۶
(۴۹) افضل حق قرشی: ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ‘ ص ۲۰۵
(۵۰) ایضاً: ص ۱۷
(۵۱) اصغر مغل: ابوالکلام آزاد کے ادبی شہ پارے
(۵۲) اصغر مغل: ابوالکلام آزاد کے ادبی شہ پارے‘ ص ۲۹۷
(۵۳) الہلال: جنوری ۱۹۱۳ء
(۵۴) عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان‘ ص ۷۶۰-۷۶۱
(۵۵) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر‘ ص ۱۰۱
(۵۶) عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان‘ ص ۷۶۰

© rasailojaraid.com